

جذبہ

04-19-2017



فہرست

اعلانات

۱. نیولین.....

بچوں کی دنیا

۲. اعتراف.....

۳. جنگل کہانی.....

سچی کہانیاں

۴. ننھی پری.....

معاشرہ اور ثقافت

۵. خواتین کا عالمی دن.....

۷. سوشل میڈیا کے دانشور.....

۸. کاروباری راز.....

نپولین

مصنف: اسد احمد

یہ اُس دور کی بات ہے جب نپولین نے روس پر حملہ کیا تھا۔ اُس کے فوجی دستے ایک اور جھوٹے سے قصبے میں جنگ میں مصروف تھے۔ اتفاق سے نپولین اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا۔ کاسک فوج کے ایک دستے نے نپولین کو پہچان لیا اور شہر کی پُرجھج گلیوں میں اُس کا تعاقب شروع کر دیا۔ نپولین اپنی جان بچانے کے لیے دوڑتا ہوا ایک بگلی گلی میں واقع ایک سمور فروش کی دکان میں جا گھسا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ دکان میں داخل ہونے کے بعد جوں ہی اُس کی نگاہ سمور فروش پر پڑی وہ بے چارگی سے کراہتے ہوئے بولا ”مجھے بچالو! مجھے بچالو! مجھے کہیں چھپا دو۔“ سمور فروش بولا ”جلدی کرو! اُس گوشے میں سمور کے ڈھیر کے اندر چھپ جاؤ!“ پھر اُس نے نپولین کے اوپر اور بہت سے سمور ڈال دیے۔



ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کاسک فوجی دستہ دندناتا ہوا اُس کی دکان میں آگھسا اور فوجی چیختے لگے ”وہ کہاں ہے؟“ ”ہم نے اُسے اندر آتے ہوئے دیکھا ہے؟“ سمور فروش کے احتجاج کے باوجود اُن فوجیوں نے سمور فروش کی دکان الٹ پلٹ کر رکھ دی۔ نپولین کی تلاش میں انھوں نے دکان کا چپا چپا چھان مارا۔ وہ اپنی تلواروں کی نوکیں سمور کے ڈھیر میں گھساتے رہے لیکن نپولین کو تلاش نہ کر پائے۔ بالآخر انھوں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور واپس چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب سکون ہو گیا تو نپولین سمور کے ڈھیر میں سے ریگتا ہوا باہر نکل آیا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی گزند نہیں پہنچا تھا۔

یعنی اسی لمحے نپولین کے ذاتی محافظ بھی اُسے تلاش

کرتے ہوئے وہاں آن پہنچے اور دکان میں داخل ہو گئے۔ سمور فروش کو جب اندازہ ہو گیا کہ اُس نے کس عظیم شخصیت کو پناہ دی تھی تو وہ نپولین کی جانب گھوم گیا اور شرمیلے لہجے میں گویا ہوا ”میں اتنے عظیم آدمی سے یہ سوال پوچھنے پر معذرت چاہوں گا! لیکن سمور کے اِس ڈھیر کے نیچے جب آپ کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ اگلا لمحہ یقینی طور پر آپ کی زندگی کا آخری لمحہ بھی ہو سکتا تھا تو آپ کو کیا محسوس ہوا تھا؟“ نپولین جو اب پوری آن بان کے ساتھ تن کر کھڑا ہو چکا تھا، سمور فروش کے اِس سوال پر غصے میں آگیا اور برہمی سے بولا ”تمہیں مجھ سے، بادشاہ نپولین سے، یہ سوال کرنے کی ہمت کیوں کر ہوئی؟“

پھر وہ اپنے محافظوں سے مخاطب ہوا ”محافظو! اس گستاخ شخص کو باہر لے جاؤ۔ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو اور اسے گولی مار دو! میں بذات خود اس پر فائر کھولنے کا حکم دوں گا۔“ محافظوں نے اُس بے چارے سمور فروش کو دیوبچ لیا اور اُسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ پھر اُسے ایک دیوار کے ساتھ کھڑا کر کے اُس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ سمور فروش کو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا، البتہ اُس کے کانوں میں محافظوں کے حرکت کرنے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں جو دھیرے دھیرے ایک قطار میں کھڑے ہو کر اپنی رائفلیں تیار کر رہے تھے۔

ساتھ ہی اُسے سرد ہوا کے جھوکوں اور کپڑوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ ہوا کے تپیرے اُس کے لباس سے ٹکرا رہے تھے اور اُس کے گال بچ ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کی ناگلیں کپکپا رہی تھیں اور وہ اُن پر قابو پانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ تب اُس کے کانوں میں نپولین کی آواز سنائی دی جس نے کھکارتے ہوئے اپنا گلا صاف کیا اور آہستگی سے بولا ”ہوشیار... شت باندھ لو۔“ اُس لمحے میں یہ جاننے ہوئے کہ اُس کے تمام احساسات و جذبات اُس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے والے ہیں، سمور فروش کے اندر ایک ایسا احساس نمودیر ہونے لگا، جسے بیان کرنے سے وہ قاصر تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے شروع ہو گئے۔



اعتراف

مصنف: حاجی بصیر سراج

اسکول میں ہر طرف خوشی کا سماں تھا آج سکول نویں اور دسویں کلاس کے درمیان میچ ہونا تھا پورے سکول کے بچوں کی زبان پر طلحہ کا نام تھا کیونکہ جب سے طلحہ اس سکول میں آیا تھا وہی ہر بار میچ جیت رہا تھا۔ میچ سے پہلے طلحہ اور حامد کا جب آمنہ سامنا ہوا تو طلحہ نے مسکراتے ہوئے حامد کو دیکھ کر کہا ہارنے کے لیے تیار رہو۔ حامد نے بس خاموشی سے دکھا اور کہا ہار جیت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ پھر کچھ دیر بعد سکول کے گراؤنڈ میں یکا یک سب لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے۔ استاذہ صاحبہ کے آتے ہی کھیل شروع ہو گیا۔ طلحہ اور حامد کے مابین مقابلہ عروج پر تھا۔ آخر کھیل تقریباً دو گھنٹے تک چلتا ہوا آخری مرحلے میں پہنچ گیا۔ پانچ اسکور اور دو گیند کی دوری پر حامد کی ٹیم جیت کی دوری پر تھی۔ گراؤنڈ میں حامد کے نام کی پکاریں اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ طلحہ کے ماتھے پر پینے کے قطرے نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے ہمیشہ سے جیت کا تقہ اپنے سر سجانے والے طلحہ سے شکست ہوتی برداشت نہ ہو رہی تھی اس کے ذہن میں کھیل شروع ہونے سے پہلے حامد کے کہے ہوئے الفاظ مسلسل گونجنے لگ گئے تھے کہ۔ ”ہار جیت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے“ وہ اسی سوچ میں گم تھا جب سکول کے گراؤنڈ میں شور برپا ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ سب لوگ حامد کو مبارک بلا پیش کر رہے ہیں اس کے والدین بھی حامد کو گلے لگاتے ہوئے دعائیں دیں رہے ہیں۔ اس کو اب اپنے والدین پر غصہ آنے لگا گیا وہ وہاں غصے سے اپنی کلاس کے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ اور ہارنے کی شرمندگی سے رونے لگ گیا۔ اسی وقت اس کے ماں باپ وہاں آگئے اور طلحہ کو سمجھنے لگ گئے کہ تمہارے مخالفوں کو تمہاری وجہ سے دفاعی لائن میں ایک زبردست شکاف مل گیا ہے اور وہ شکاف تم ہی ہو۔

زندگی کی سب سے بڑی حقیقت اعتراف ہے۔ ایمان ایک اعتراف ہے۔ کیونکہ ایمان لا کر آدمی اپنے مقابلہ میں خدا کی بڑائی کا اقرار کرتا ہے۔ لوگوں کے حقوق کی ادائیگی اعتراف ہے۔ کیونکہ ان پر عمل کر کے ایک شخص بین انسانی ذمہ داریوں کا اقرار کرتا ہے۔

بیاتم کو حامد کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے اور اس کو اس کی جیت پر مبارک آباد دینی چاہیے۔ اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے کھیل اچھا کھیلا ہے۔ اور یہی اعتراف تمہاری جیت ہوگی۔ اصل خوشی دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا ہے۔

حامد نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور چلتا ہوا گراؤنڈ میں بنے میچ پر چڑھتا ہوا حامد کے سامنے جا کھڑا ہوا جہاں پر سب استاذہ اکرام حامد کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لے کر بلا رہے تھے۔ سب سے پہلے اس نے حامد کو مبارک بلا پیش کی۔ پھر مائیک پکڑے حامد کے ساتھ جا کھڑا ہوا وہاں موجود سب لوگ خاموشی سے اسے سننے لگا۔

جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ پچھلے سالوں سے میں ہی سکول میں جیتتا آ رہا ہوں اور اس بار یہ بازی حامد لے گیا ہے میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ حامد نے اس بار مجھے سے زیادہ اچھا کرکٹ کھیلا ہے اس بار حامد اس کھیل کا ”چیمپئن“ ہے۔

میں نے آج سیکھا ہے کہ اعتراف تمام ترقیوں کا دروازہ ہے۔ مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اعتراف کے لیے آمادہ کر سکے۔ جب بھی ایسا کوئی موقع آتا ہے تو آدمی اس کو اپنی عزت کا سوال بنا لیتا ہے۔ وہ اپنی غلطی ماننے کے بجائے اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خرابی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آ جاتا ہے کہ جس غلطی کا صرف زبانی اقرار کر لینے سے کام بن رہا تھا اس غلطی کا اسے اپنی برہادی کی قیمت پر اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ اور میں برہادی کی کسی قیمتی پر آکر اعتراف نہیں کرنا چاہتا ہوں۔

بے شک ہار جیت اللہ کے ہاتھ میں ہے اس نے یہ جملہ بولتے ہوئے حامد کی طرف دیکھا اور اسی وقت حامد نے طلحہ کی طرف دیکھا تو وہ دونوں مسکراتے ہوئے طلحہ نے کہا کہ آخری بات جو میں آپ سب کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے میں اپنے استاذہ اپنے ماں باپ اور حامد کا شکر گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنے علم و حکمت سے سمجھا کر بتایا کہ غرور و تکبر اور اپنی غلطی پر پردہ ڈالنے یا ہارنے پر حسد کرنے کی بجائے دوسروں کی خوشی میں خوش ہو کر اپنی ہار کو جیت بنا کر خوش رہنا چاہیے شکریہ۔

پورے حال میں تالیوں کی گونج گھوم رہی تھی طلحہ پر سکون ہو کر اپنی ناکامی کو بھول کر دوبارہ سے کامیابی حاصل کرنے کی کوشش میں لگن ہو گیا۔ طلحہ کا یہی اعتراف اس کی جیت بن گیا تھا۔

جنگل کہانی

مصنف: علی احمد



نتیجہ:

بچوں اس کہانی سے یہ سبق ملتا ہے کہ آپ بغیر سوچے سمجھے کسی کی باتوں میں نہ آؤ نہیں تو نقصان اٹھانا پر سکتا ہے۔



شیر نے کہا دیکھو بھی تم سب جانتے ہو کہ لومڑی چالاک ہوتی ہے لہذا میں تو اس کو یہاں رکھنے کو تیار نہیں باقی تم ساروں کی مرضی۔ جانوروں کو لومڑی پر ترس آگیا اور آخر جانوروں کے کہنے پر شیر نے لومڑی کو جنگل میں رہنے کی اجازت دے دی۔ پہلے پہل تو لومڑی بڑی شریف بن کر رہی اور کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کی۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ اُس نے اپنے رنگ دکھانے شروع کر دیئے۔ اور جانوروں کو اپنی باتوں میں پھنسانے لگی۔ وہ اُن سے کہتی کہ شیر تمہارے کمزور ساتھیوں کو کھا جاتا ہے اور تم لوگ چپ رہتے ہو اگر ایسا ہی رہا تو ایک دن تم سب مارے جاؤ گے۔ شروع میں تو جانوروں نے لومڑی کی باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ لیکن آخر جانور لومڑی کی باتوں میں آگئے اور انہوں نے شیر کے خلاف بغاوت کر دی۔ اور سارے شیر کو مارنے پر تُل گئے۔ لیکن وہ کمزور تھے اور خود کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ لومڑی نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا میں ساتھ کے جنگل کے شیر کو جانتی ہوں وہ اُس شیر کو مار دے گا۔ جانور کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر انہوں نے حامی بھر لی۔ اور بی لومڑی ایک دن دوسرے جنگل کے شیر کو لے آئی۔ اس نے آتے ہی متاثرہ جنگل کے جانوروں کے بادشاہ کو خون ریز لڑائی کے بعد مار دیا۔ جس پر جنگل کے جانور بہت خوش ہوئے اور اُس کو اپنا نیا بادشاہ بنا لیا۔ لیکن کچھ دنوں بعد نئے شیر نے بھی جانوروں پر ظلم شروع کر دیا۔ سب جانور اپنے کئے پر رونے لگے۔ آخر انہوں نے ہمت کی اور ہاتھی سے مدد کی درخواست کی۔ پھر ایک دن ہاتھی اور جنگل کے تمام جانور اکٹھے ہوئے اور شیر کو جنگل سے بھگا دیا۔ اور لومڑی کی بھی خوب خبر لی اور اُس کو بھی جنگل سے نکال دیا۔ جانوروں نے ہاتھی کو اپنا بادشاہ بنا لیا۔ اور سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

نہی پری

مصنف: حاجی بصیر سراج



میں حسبِ معمول اپنے گھر کے قریب وسیع و عریض پارک میں شام سے پہلے واک کرنے آیا ہوا تھا سردیوں کا آغاز ہو چکا تھا گرمیاں رخصت ہو رہی تھیں ٹھنڈی ہواؤں میں خشکی کا احساس بڑھ رہا تھا موسم کی خوشگواریت کی وجہ سے بہت سارے لوگ پارک میں آئے ہوئے تھے بچے، نوجوان، بڑھے اور بوڑھے ہر عمر کے لوگ سبزہ پھول درخت جمیل ہر طرف خدا کی قدرت اپنی رعنائی کا اور دلکشی کا مسکور کن احساس دلا رہی تھی کیونکہ گرمی کے بعد اب ٹھنڈ شروع ہو چکی تھی اس لیے واک کرنے والے اور پارک کی سیر کرنے والوں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی میں جو بچپن سے سبزے ہریالی درخت پھول جمیل فطرت کا شوقین ہوں سب کچھ انجوائے کرتا ہوا تیزی سے مٹی کے واکنگ ٹریک پر ادھر ادھر دیکھتا بڑے بڑے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا حسبِ معمول میرے ہونٹوں پر اسماء الحسنی کا ورد جاری تھا پارک سبزہ فطرت کے خوبصورت مناظر اور اللہ کا ذکر سبحان اللہ میرا جسم اور روح کیف انگیز کیفیت کو انجوائے کر رہے تھے خوشگوار موسم کے اثرات سے میرا جسم روح سرشاری کی حالت میں تھے دورانِ واک چند ایسے دوستوں کا سامنا بھی ہوا جو اکثر یہاں واک کرتے ہیں ان سے مسکراہٹ کا تبادلہ کر کے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ پارک میں لاہو ر کے لوگوں کے علاوہ بہت بڑی تعداد مسافروں یا باہر سے آنے والے لوگوں کی ہوتی ہے مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کا اپنا اپنا کچر زبانیں رنگ و جسامت یہ سب مل کر ایک مخلوط کچر سا بنلاپتے ہیں میں ان کو بغور دیکھتا جا رہا تھا اکلاکائے شادی شدہ جوڑے بھی نظر آ رہے تھے جو دنیا ما فیہا سے بے خبر اپنی ہی دھن میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھے یا چلتے نظر آ رہے تھے یہ نئے شادی شدہ جوڑے اپنی ہی دھن میں شادی کے غبار میں مست چہروں پر رنگوں کی قوس قزح بکھیرے نظر آ رہے تھے میں چونکہ بچپن سے متجسس مزاج رکھتا ہوں اور اس لیے بغور لوگوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا پارک میں اکثر نوجوانوں کے مختلف ٹولے بھی نظر آتے ہیں جو نوجوان لڑکیوں کو چھیڑنے یا آوازیں کسے سے باز نہیں آتے وہ بھی نظر آ رہے تھے ہر شریف انسان کی طرح مجھے بھی ان پر بہت غصہ آتا تھا لیکن ساتھ یہ بھی سوچ کہ یہ عمری ایسی ہے جس میں خوف ہوش کی بجائے صرف جوش اور جوش ہی ہوتا ہے اس لیے ایسے لڑکوں کو نظر انداز کر دیتا میں واک کرتا ہوا پارک کے ایسے حصے میں آگیا جہاں مجھے ایسا ہی ادبش نوجوانوں کا ٹولا نظر آیا جو شاید کسی لڑکی کو تنگ یا اس پر آوازیں کس رہے تھے میں روزانہ کی طرح نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا لیکن جب واک کرتا ہوا پورا چکر لگا کر دوبارہ اسی جگہ پر آیا تو دیکھا کہ وہ لڑکے اسی طرح ہی لڑکی کو تنگ

اور آوازیں کس رہے تھے اب میں نے بغور اس لڑکی کی طرف دیکھا تو سامنے ایک پندرہ سولہ سال کی سکول کے یونیفارم میں ملبوس کسی چھوٹے شہر کی دھان پان سی سلاہ لڑکی نظر آئی جھکائے بیٹھی تھی اس کی گود میں اس کا کتا بوں کا بیگ بھی تھا پہلے تو میں ہلکا مزاق سمجھ کر گزر گیا اب مجھے معاملہ سنجیدہ نظر آنے لگا میں تھوڑی دور جا کر رک گیا اور حالات کا سنجیدگی اور نزاکت کا احساس کرنے لگا میں غور سے دیکھ رہا تھا تین یا چار لڑکے تھے جو باری باری اس کو تنگ کر رہے تھے وہ لڑکی سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے پاس اس کی کوئی ساتھی یا بزرگ نہیں تھا میں نے چند منٹوں میں ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ اکیلی لڑکی ہے اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں سورج غروب ہونے کو تھا رات کا آٹھ بج رہی تھی وہ روشنی کو نگل رہا تھا نیم اندھیرے کی وجہ سے لڑکوں کی بدتمیزی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا بلکہ وہ شاید اندھیرے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ زیادہ بدتمیزی کر سکیں میں سمجھوتہ کو بھانپ چکا تھا کہ کوئی اس لڑکی کو یہاں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے اور یہ بھاری اس کا یا تو انتظار کر رہی ہے یا پھر اس کو سمجھ نہیں آ رہی کہ اب اس پر دیکھی شہر میں وہ کیا کرے وہ مجبوری بے بسی کا بت بنی بیٹھی تھی اب میں جان چکا تھا کہ لڑکی شدید خطرے میں ہے اور کسی خوفناک حادثے کا شکار ہو سکتی ہے میں نے فوری طور پر اپنے واقف سیکورٹی گارڈ کو بلا دیا اور اس لڑکی کی طرف بڑھا مجھے اور سیکورٹی گارڈ کو آتے دیکھ کر ادبش بڑے تیزی سے بھاگ گئے میں آہستہ آہستہ بیٹی کے پاس ہو گیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بری طرح ڈر گئی خوف اور پردیس کی وجہ سے اس کا جسم لرز رہا تھا اس کے چہرے پر خوف کی زردی پھیلی ہوئی تھی اور آنکھوں میں خوف دہشت و یرانی اور قبرستان کے سانے کا راج تھا میں شفیق لہجے میں بولا بیٹی مجھ سے ڈرو نہ میں آپ کے باپ جیسا ہوں تم میری بیٹی ہو اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے آپ میری بیٹی ہو اب تمہیں کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے میرے لہجے کی شفقت اور مٹھاس سے اس کی آنکھوں میں زندگی کی رمت لہرائی اور اس نے میری طرف دیکھا میرے شفقت سے لبریز لہجے سے اس کے اندر جیسے کوئی آنسوؤں کا جہرنا پھوٹ پڑا جیسے خود بخود کوئی والو کھل گیا ہو اور پانی بہنا شروع ہو گیا اس کی معصوم آنکھوں میں عجیب سا سیلاب تھا جو اب بند توڑ کر بہہ نکلا تھا نہ اس کے چہرے کا زاویہ بدلا نہ ہی کوئی آہ بکا نہ سسکی نہ چیخ نہ آواز پانی اس کی آنکھوں سے اس کے رخساروں کو مسلسل تر کرنے لگا اس کے اندر کا کرب اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا خوف اور دہشت سے وہ شاید قوت گو پائی سے محروم ہو چکی تھی آنسوؤں کی کثرت نے اس کی قوت گو پائی جھین لی تھی یہ وہ کلت کا شکار ہو چکی تھی مجھے اس پر بہت پیا آ رہا تھا میں اس کی بے بسی اور آنسوؤں کی برسات سے اندر ہی اندر کٹ رہا تھا وہ نہی معصوم پری اپنے آنسوؤں سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کی داستان سنا رہی تھی۔ میرے شفقت بھرے رویے کی وجہ سے اس نے کئی بار بولنے کی کوشش کی لیکن زبان شاید اس کے اختیار میں نہیں تھی یا خوف نے اس کے جسم و جان کو اس بری طرح جکڑا ہوا تھا کہ الفاظ زبان پر آنے سے پہلے ہی تہلیل ہو جاتے تھے اس کے اعصاب اور عضلات کسی بہت بڑی منفی کیا کی تبدیلی سے گزرے تھے کہ ان کا اس میں تال میل ختم ہو حرکت بیٹھی تھی مجھے لگ رہا تھا وہ شاید نیم فالجی کیفیت کا شکار ہو چکی ہی وہ اپنے آپ میں نہیں تھی اس کا جسم اور دماغ کسی شدید حادثے سے گزرنے کے بعد کام کرنا چھوڑ چکے تھے اس کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ جا رہی تھی میں نے اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھ دیا محفوظ ہو تم بالکل نہ ڈرو وہ خاموش گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی درد دکھ نمی بن کر اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا وہ رونے کی کوشش نہیں کر رہی تھی آنسو اس کے ضبط کے سارے بندھن توڑ کر خود بخود بہنے جا رہے تھے اس کے اندر پتہ نہیں کتنے سسندوں کا پانی تھا جو ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اس کا معصوم نازک چہرہ لگا تھا آنسوؤں سے جھجک چکا تھا میں چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ بولے الفاظ نکلے وہ مجھے بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا اور پھر بلک بلک کر رونے لگی۔

خواتین کا عالمی دن

مصنف: علی احمد



بیروکار عورت کو عزت دینے میں اتنے بخیل کیوں؟ اسی پاکستان میں جو بنا ہی اسلام کے نام پر تھا آج بھی اس معاشرے میں جسمانی اور ذہنی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے کہیں اسے ورثت میں حصے سے محروم رکھا جاتا ہے تو کہیں غیرت کے نام پر اس کا خون بہایا جاتا ہے۔ دنیا میں ہر چیز کے کچھ منفی اور کچھ مثبت پہلو ہوا کرتے ہیں۔ مرد چاہے مغربی معاشرے کا ہو یا مشرقی معاشرے کا اگر اس کی سوچ مثبت اور تعمیری ہو۔ اگر وہ اخلاقیات کے اعلیٰ درجہ پر ہو تو وہ عورت کو ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھے گا۔ یہ اس کی تربیت ہے جو اسے عورت کی عزت کرنا سکھاتی ہے۔ اور مرد کی تربیت ماں کی گود سے شروع ہو کر خاندان کے ماحول سے ہوتی ہوئی معاشرے کے طور طریقوں پر ختم ہوتی ہے۔ مثبت سوچ کے مالک لوگ نہ صرف عورت کو عزت دیتے ہیں بلکہ انہیں خاندان اور معاشرے کا نہایت اہم رکن کی حیثیت سے قبول کرتے ہیں وہ اپنی ماں، بیوی اور بہن اور بیٹی ان سارے حوالوں سے عورت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اگر معاشرے کے مثبت پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کئی روشن مثالوں کو بیان کریں تو اسی معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے جدوجہد آزادی میں سرگرم رہنے والی خاتون ”فاطمہ جناح مارو ملت“ کہلائیں۔ معاشرے کی فلاح اور رہنمائی کا بیڑا سر پر اٹھائے ہوئے دن رات مصروف عمل رہنے والی بلیقیں ایدھی ایک منفرد اور اعلیٰ سوچ رکھنے والے عظیم انسان کی بیوی ہے۔



ادبی دنیا میں ایک اعلیٰ مقام رکھنے والی عظیم ادیبہ بانو قدسیہ کو بھی اشفاق احمد جیسے اعلیٰ پایے کے محقق اور مدبر انسان کی معاونت حاصل رہی۔ انوار پاکستان میں بھرتی ہونے والی خواتین جو اپنی زندگی داؤ پر لگا کر فرض کی تکمیل کے لیے ہر روز ڈیوٹی پر موجود ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک فلائنگ آفیسر مریم مختیار اس وطن عزیز کیلئے جان کا نذرانہ پیش کرنے والی باہمت بیٹی کا جنم بھی تو اسی معاشرے میں ہوا تھا۔ اناک اور نیوکلیر فنرکس میں مہارت رکھنے والی اس قوم کی غیور ”بیٹی“ ڈاکٹر عافیہ صدیقی، بھی تو کسی باپ کی بیٹی، کسی شوہر کی بیوی اور کسی بیٹے کی ماں ہے۔ کسی تہذیب میں تو مرد عورت کی تعلیم میں روکاوٹ بنا تو کسی جگہ اسی کی سپورٹ کرنے میں سر فہرست رہا۔ عورت اس معاشرے کا نہایت اہم جزو ہے۔ جس کے بغیر نہ نسلیں چل سکتی ہیں نا قومیں بن سکتی ہیں۔ عورت کے وجود سے ہی زندگی ہے سوال یہ ہے کہ ”عورت آخر چاہتی کیا ہے؟“ عورت عزت چاہتی ہے تحفظ چاہتی ہے۔ عورت تعلیم حاصل کر کے زندگی کی دوڑ میں مرد کے ساتھ چلنا چاہتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ عورت کا حقیقی مقام سمجھتے ہوئے جو ایک ماں بھی ہے اور ایک بیٹی بھی وہ بیوی ہے اور بہن بھی و معاشرے کی ترقی میں عورت کے کردار کو سمجھا جائے۔ تعلیم عورت کا بنیادی حق ہے۔ پڑھی لکھی ماں ہی پڑھے لکھے معاشرے کو جنم دے سکتی ہے۔ عورت کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کر کے معاشرے اور آنے والی نسلوں کے مستقبل کو روشن بنایا جا سکتا ہے اور ملک کی ترقی اور خوشحالی کا ایک نیا دور شروع ہو سکتا ہے۔

مارچ کی 8 تاریخ خواتین کے عالمی دن کے طور پر منائی جاتی ہے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے جنت ماں کے قدموں میں رکھ دی ہے تو دوسری طرف آج بھی ہمارے معاشرے میں عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھا جاتا ہے عورت کے حقوق پہ بحث کوئی نئی بات نہیں کئی صدیوں سے عورت اپنے حقوق کے حصول کے لیے جہد مسلسل میں ہے۔ وہی حقوق جن کی ادائیگی آج سے 14 سو سال پہلے اسلام کر چکا۔ اسلام جس نے عورت کو عزت و مقام دید۔ ورنہ اسلام کے آغاز سے پہلے عرب میں عورت کو زندہ گاڑ دیا جاتا تھا۔ لڑکی کی پیدائش ایک نوحست سمجھی جاتی تھی۔ عورت کو فساد کی جڑ سمجھا جاتا تھا۔ ہندو معاشرہ جو آج بھی عورت کو مکمل حقوق دینے سے قاصر ہے۔ شوہر کے مرنے کے بعد عورت دوبارہ سے نامل زندگی گزارنے کا حق نہیں رکھتی۔ عورت کو ”ستی“ جیسی بے بنیاد اور غیر انسانی رسم کے مطابق زندگی گزارنا پڑتی ہے۔ مغربی معاشرے کی عورت جو کبھی Feminism کی قائل تھی اب اس معاشرتی آزادی سے تنگ آتی دکھائی دے رہی ہے۔ فرانس جیسے ترقی یافتہ ملک میں عورت کو ووٹ ڈالنے کی آزادی نہیں تھی کچھ سال قبل عورت کو ووٹ ڈالنے کا حق حاصل ہوا۔ عورت جو مغربی معاشرے میں مرد کے شانہ بشانہ معاشی ریس میں چلتی چلتی اب تھک چکی ہے۔ اس معاشرے میں جہاں عورت کو مرد کے برابر کام کرنا پڑتا ہے۔ جہاں زندگی کی ساری سہولیات کے حصول کے لیے انسان دن رات کام تو کرتا ہے مگر پیسے اور کام کی اس دوڑ میں کہیں رشتے اور خاندان بہت دور جا چکے ہیں۔ مشرقی معاشرہ جو ایک طرف تو غیرت کے نام پر بہن و بیوی اور بیٹی کا قتل جائز سمجھتا ہے۔ دوسری طرف اسی معاشرے میں کسی کی بھی بیوی، بہن اور بیٹی سڑک و بس سٹاپ اور گلی بازاروں میں چلتی پھرتی خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے۔ اس کم پڑھے لکھے اور غیر ترقی یافتہ معاشرے میں اگر کوئی لڑکی بس کے انتظار میں ”بس سٹاپ“ پہ کھڑی ہو تو ہر عمر کا مرد اُسے لفت دینے کیلئے تیار کھڑا ہوتا ہے۔ ایسا معاشرہ جہاں کسی مرد کو اپنی غیرت اور عزت کو محفوظ چاہیے مگر کسی دوسرے کی عزت انہی سڑکوں پہ زسوا کی جاتی ہے۔ آج اکیسویں صدی کے اس نام نہاد مہذب معاشرے میں عورت کی تعلیم اس کے حقوق اور آزادی پہ بات کرنے والوں نے کیا صحیح معنوں میں عورت کو عزت دینے کی کوشش کی؟ عورت کی تعلیم جس کی بات آج مغربی معاشرہ کرتا ہے اس کے بارے میں احکام تو اسلام چودہ سو سال قبل دے چکا ہے۔ نبی کریم کے ارشاد کے مطابق ”علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے“ ایسا پریکٹیکل مذہب جو صدیوں پہلے ہی عورت کے حقوق متعین کر چکا جو عورت کو تعلیم کا حق دے چکا۔ اسی مذہب کے

مصنف: حاجی بصیر سراج

زید سے ہماری سلام دعا یا گپ شپ فیس بک کے ذریعے ہوئی، گپ شپ بھی بذریعہ میج ہوتی رہی، دوران گپ شپ پتہ چلا کہ یہ صاحب کسی مذہبی جماعت کے کارکن اور ایک بہت بڑے مذہبی رہنما کے ماننے والے ہیں ایک دن انہوں نے ہمیں فیس بک کے ان باکس میں میج کیا کہ "قتلین بھائی! میری وال پر فلاں صاحب نے میرے قلم کے بارے میں عجیب و غریب بتلے لکھ رکھے ہیں، پلیز آپ اسے جواب دیں" ان کی بات نے حیران کر دیا، ہم نے عرض کی "حضور! دیکھیں جو سکتا ہے کہ آپ کے قلم کے حوالے سے ہمارے بھی تحفظات ہوں اس لئے آپ براہ کرم ہمیں معاف رکھیں،" زید نے کہا کہ "آپ ایسا کریں میری وال پر اگر ایک دفعہ دیکھ لیں کہ اس نے کیا کواکس کر رکھی ہے، اس کے بعد آپ مجھے اس کا جواب لکھ کر ان باکس کریں" تجویز خاصی معقول تھی اس لئے ہم نے حامی بھر لی، اتفاق دیکھئے کہ ان کی وال پر عجیب و غریب تبصرے کر نیا لے صاحب (انہیں آپ بکر سمجھ لیں) بھی ہمارے فیس بکی دوست تھے، بکر کے تبصرہ کو غور سے پڑھا اور پھر اس کا اردو فانٹ میں جواب لکھ کر زید کو ان باکس کر دیا، دو تین مرتبہ یہ کام کرنے کے بعد اچانک بکر کی طرف سے ان باکس میں میج ملا "قتلین بھائی! یہ لڑکا زید جو ہے، اس کی وال پر میری بحث چل رہی ہے اچانک اس نے اتنے دلائل کے ساتھ جواب دینا شروع کر دیا کہ میں حیران ہوں، آپ پلیز میری حملت میں لکھ دیں کیونکہ آپ نے بھی ایک سے زائد مرتبہ اس کے قلم کے حوالے سے کچھ ایسی ویسی باتیں لکھی تھیں" ہم نے عرض کی "حضور! وہ باتیں اس وقت کے حساب سے تھیں ہمارا ان کے قلم سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں اس لئے آپ ہمیں معاف رکھیں" بکر نے منت کے انداز میں کہا کہ "اچھا ایسا کریں آپ جواب لکھ کر مجھے ان باکس کر دیں میں خود پوسٹ کر دوں گا"

[illegible]

اس کے بعد یقیناً بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ ہمارا ایک ڈیڑھ گھنٹہ ایسی بحث مباحثہ کے چکر میں گزر گیا، گو کہ ابتدا میں یہ کام بڑا ہی دلچسپ تھا لیکن بعد میں یوریت ہونے لگی تو ہم نے فیس بک سے جان چھڑا مناسب سمجھی۔ خیر اگلے دن زید نے آن لائن ہوتے ہی پھر کہا کہ "واہ تقنیین بھائی مزہ آ گیا آپ نے بکر کو خوب مزہ پکھلایا" ابھی ہم ان کے تعریفی جملوں کا کھلف اٹھا رہے تھے کہ بکر صاحب نے آن لائن ہوتے ہی تقریباً ایسے ہی ملتے جلتے میج کئے، ہم نے دونوں کی تعریفیں دونوں ہاتھوں سے سٹیئیں اور گلے سے لگالیں۔

صاحبو! سوشل میڈیا پر محض یہ دو ہی ایسے کردار نہیں بلکہ روزانہ ایسے کردار سے واسطہ پڑتا ہے، جن کی فرمائش بھی عجیب ہوتی ہیں، ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے لکھے پر واہ واہ کرنے کے علاوہ چند ایک جملے بھی لکھے جائیں تاکہ ان کی پوسٹ کی گئی "تخلیق نما شے" کی اہمیت و افادیت بڑھ جائے۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑیے یہ دیکھئے کہ واہ واہ کی خواہش کسے نہیں ہوتی لیکن سوشل میڈیا خاص طور پر فیس بک کے حوالے سے عجب طرز کی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں اس دنیا کے دانشور جس قدر سچے اور یکے ہیں اسی قدر واہ واہ کریں والوں کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ پاناما کیس سے لیکر پلری ایس ایل تک ، اگر فیس بکی دانشوروں کے تبصرے پڑھے جائیں تو بندہ خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر اتنی ہی دانش ان افراد میں ہوتی تو قوم کی یہ حالت نہ ہوتی۔ گویا دانش بچاری بھی دانشوروں کی عقل پر ماتم کرتی نظر آتی ہے۔ 2013 کے انتخابات کے دوران بھی عالم کچھ ایسا ہی تھا ، طرح طرح کے تبصروں سے ہم نے نتیجہ اخذ کیا کہ اب کی بار نہ تو پیپلز پارٹی جیت پائے گی اور نہ ہی مسلم لیگ کے سر کامیابی کا سہرا سچے گا ، عمران خان بھی بس فتنی فتنی کامیابی حاصل کریگے ؟ لیکن اصل کامیابی ہوگی کس کی؟ یہ سوال الیکشن کے نتائج تک ادھورا رہا لیکن جو نئی انتخابات ہوئے تو پتہ چلا کہ مسلم لیگ ن واضح اکثریت کے ساتھ حکومت بنانے کی پوزیشن میں ہے۔ سوال وہی کہ اگر فیس بک کے دانشوروں کے اٹھائے گئے چاند سورج کے بارے قیاس کیا جائے تو یہی لگتا ہے کہ ابھی دن کو رات اور رات کو دن بنا لو گے۔

ایک ایسے ہی فیس کی دانشور سے بات چیت ہو رہی تھی فرمانے لگے " پی ایس ایل کی ٹیوں کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کراچی کنگز، لاہور قلندر جیسی ٹیوں پر خود انہیں بھی اعتبار نہیں، پشاور زلی، کوئٹہ گلیڈی ایٹرز کے جیتنے کے بھی امکانات کم ہیں، اسلام آباد یونائیٹڈ بھی گزشتہ برس جیسی مضبوط ٹیم نہیں ہے" اس تبصرہ نگار سے ہم نے پوچھا " پھر کون جیتے گا " یہ سوال پڑتے ہی انہوں نے فرمایا " اوہ ہو وہ، یہ

تو مجھے مادہ ہی نہیں رہا "

یہی صورتحال پانامہ لیکس کے حوالے سے بھی درپیش ہے ، طرح طرح کے تبصرے پڑھنے کے بعد بندہ خواہ خواہ ہی خود کو رنج سمجھ بیٹھتا ہے اور ان تبصروں کی روشنی میں فوراً فیصلہ صادر کردیتا ہے کہ نوازشریف کو عہدہ سے ہٹانے کے علاوہ عمر بھر کیلئے نااہل قرار دیا جاتا ہے ۔ ان میں سے بعض تبصرے تو بڑی ہی دلچسپی کے حامل ہوتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر عدالت عظمیٰ کی جیوری وہ پڑھ لے تو ان کی فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی ، یقیناً کریں کہ قانون، آئین کی تشریحات جس قدر دلچسپ انداز میں فیس بک پر نظر آتی ہیں اس کا عشرِ عشر کوئی حقیقی ماہر قانون و آئین نہیں ہو سکتا۔

ایک تبصرہ نگار سے اچھی خاصی سلام دعا ہے، انکے ہر ادبی، سیاسی تبصرہ پر واہ واہ کریواؤں کی تعداد ہمیشہ سینکڑوں میں ہوتی تھی، ایک دن ہم نے مشورہ دیا کہ 'آپ اچھا لکھتے ہیں آپ کی تحریروں، تبصروں میں جامعیت ہوتی ہے لہذا کسی قومی روزنامہ کا تصدیق کر لیں' انہوں نے بڑے ہی فخریہ انداز میں جواب دیا "انشا اللہ آپ آئندہ چند دنوں میں کسی بڑے قومی اخبار میں میری تحریر پڑھ سکیں گے" کچھ دن انتظار یہیں گزر گئے پھر پتہ چلا کہ ایک قومی اخبار انچارج ادبی صفحہ نے ان کے تبصرہ پر عجیب سا تبصرہ کیا "کچھ حصہ تو ڈائلریونس بٹ کی تخلیقات سے متاثرہ نظر آتا ہے، کچھ جملوں کی کانٹ چھانٹ فلاں فلاں رائٹر کے زیر اثر ہے، بعض بیروں پر فلاں فلاں ادبی لکھاری نے پہلے سے ہی قبضہ جمایا ہوا ہے اور جملوں کی کاٹ حسن ثار سے مستعار لی گئی ہے" اس تبصرہ نگار کے تبصرہ پر اتنا بھڑپور تبصرہ یقیناً بہت ہی دلچسپ تھا کہ اس کے بعد مزید کسی تبصرے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہی



کاروباری راز

مصنف: سفیان خان

اس دوکان سے مجھے میڈیسن خریدتے تیسرا روز تھا، اور میں میڈیکل سٹور والے کی خوش اخلاقی سے کافی متاثر بھی تھا، اسی وجہ سے میں بار بار اسی دوکان والے کے پاس جا رہا تھا۔ ہسپتال میں موجود مریض جس کیلئے ادویات خریدی جا رہی تھیں اب تقریباً صحتیاب ہو رہا تھا۔



ڈاکٹرز نے جو ادویات لکھ کر دی تھیں، ان میں سے کچھ ادویات بچ گئیں تھیں جو کہ فل پیکیڈ اور قابل استعمال تھیں۔ میں نے سوچا یہ ادویات واپس کر دی جائیں۔ جب میں اس ارادے سے میڈیکل سٹور والے کے پاس پہنچا اور اسے ادویات کی واپسی کا بولا تو پہلے تو اس نے میری طرف عجیب نظروں سے دیکھا پھر ایسے رد عمل کا اظہار کیا جیسے میں نے اسے کوئی گالی نکال دی ہو۔ اس نے ادویات واپس لینے سے صاف انکار کر دیا۔ میں حیران رہ گیا کہ جس بندے کے پاس صرف اس کی خوش اخلاقی کی وجہ سے بار بار میں جا رہا تھا اب میرے ساتھ کس طرح کا حسن سلوک کر رہا ہے۔ خیر میں نے زیادہ اصرار کیا تو موصوف کہنے لگے کہ واپسی اس صورت میں ہوگی اگر آپ نقد رقم واپسی کی بجائے کوئی دوسری میڈیسن خریدیں۔ پھر مجبوراً مجھے متبادل کے طور دوسری ادویات خریدنی پڑی، لیکن واپسی پر میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہے تو وہ مسلمان اور باہر بورڈ میں نام میں بھی حاجی لکھا ہوا ہے۔ لیکن مسلمان دیتے وقت اور لیتے وقت اس کے رویے میں فرق کیوں تھا؟ اس رویہ کی وجہ سے میں نے آئندہ کبھی بھی اس سے کچھ نہ خریدنے کا تہیہ کر لیا۔ اس طرح کے واقعات ہو سکتا ہے آپ کے ساتھ بھی رونما ہوئے ہوں، لیکن اس واقعہ کے پیچھے ایک اہم کاروباری راز پوشیدہ ہے جس کو ہمارے بیشتر تاجر اور کاروباری حضرات جانتے ہی نہیں۔

آج کے زمانے میں خریدی ہوئی چیز واپس لے لینا۔ واقعتاً بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ رویہ یا تو وہ اختیار کرے گا جو یا تو اس عمل پر اخروی ثواب کی امید رکھتا ہو۔ دوسرا وہ جو اس رویے کے در پردہ مالی فوائد کو سمجھ سکے۔ وال مارٹ والے ظاہر ہے گاہک سے چیز ثواب کی نیت سے واپس نہیں لیتے۔ یہ سب کچھ وہ دنیا کے مفادات کی خاطر انتہائی گہری تحقیق کے بعد کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اتنی فراخ دلی جب دکھائی جائے گی تو کچھ لوگ اسے غلط ضرور استعمال کریں گے۔ انہوں نے اس بات پر بھی غور کر رکھا ہے۔ چنانچہ کمرس کے بعد وال مارٹ کے باہر ایک طویل قطار سلمان واپس کرنے والوں کی لگتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کمرس کے لیے جوتے، کپڑے اور ٹائی وغیرہ لے جاتے ہیں اور چند دن استعمال کر کے اس پیشکش کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے واپس کر دیتے ہیں۔ لیکن وال مارٹ میں اسے بھی واپس لے لیا جاتا ہے۔ کیوں؟ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے اندازے کے مطابق اس قسم کے لوگ معاشرے میں 3 یا 4 فیصد سے زیادہ نہیں ہوتے۔ اب اگر ان سے پوچھ گچھ کریں گے تو ہمارے 96 فیصد گاہک متاثر ہوں گے۔ لہذا ہم یہ دھوکا کھانے کے لیے تیار ہیں۔ دیکھیے! ہم جس چیز کو مشکل سمجھ رہے ہیں، وہ مغرب میں "کاروباری راز" کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ پاکستان کے بازاروں میں ایسا کیوں نہیں۔ غالباً اس کی وجہ دینی معلومات کی کمی یا دنیاوی فوائد کے لیے سنجیدہ ریسرچ سے گریز ہے۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ ہمارے ہاں بدعنوانی زیادہ ہونے کی وجہ سے وال مارٹ کی طرح آفر نہیں دی جاسکتی لیکن ضروری تحفظات کے ساتھ اس پر عمل تو ہو سکتا ہے۔ اگر ہم اس "کاروباری راز" پر سنت نبوی ﷺ سمجھ کر ہی عمل کرنا شروع کر دیں تو یقیناً ثواب کے ساتھ ساتھ کاروبار کو بھی بڑی تیزی سے بڑھایا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں سوچیے گا ضرور!

اسلامی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو خرید و فروخت کے معاملہ کو ختم کرنے کو شریعت میں "اقالہ" کہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ خریدار خریدی ہوئی چیز دوکان دار کو واپس کر دے اور کاندھ خریدار کی اداکردہ رقم واپس کر دے۔ آپ ﷺ کا قول ہے "جس نے کسی خریدے ہوئے سلمان کو (بلا بحث و مباحثہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے) واپس لے لیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے گناہ مٹا دیں گے۔" مگر ہم لوگ مسلمان ہونے کے باوجود اس پر عمل نہیں کر پارہے، اور غیر مسلموں نے اس پر عمل کر کے اس اہم "کاروباری راز" کو پا لیا ہے۔ ایک اور واقعہ بیان کرتا ہوں جسے سن کر مجھے لگا جیسے میں کوئی خیر القرون کا قصہ سن رہا ہوں۔ پاکستان میں اکاؤنٹنگ اینڈ فنانس کے ایک صاحب ہیں اپنے ساتھ امریکہ میں پیش آیا واقعہ بتاتے ہیں کہ کپڑا خریدے دو ماہ ہو چکے تھے۔ بیگم نے کھول کر دیکھا تو اسے اپنے معیار کا نہ پایا۔ کہنے لگیں یہ واپس کر آئیں۔ میں نے کہا بھئی دو ماہ ہو چکے۔ اب واپس نہیں ہوگا۔ بیگم صاحبہ نے اپنی اٹلی جنس رپورٹ کا حوالہ دیتے ہوئے یقین سے کہا یہاں واپس ہو جاتا ہے۔ میں نے ہتھیار ڈالنے ہوئے کہا اچھا چلو رسید دے دو، میں سوچتا ہوں۔ اہلیہ نے حیرت کا دوسرا جھٹکا دیتے ہوئے کہا رسید بھی گم ہوگئی، لیکن واپس ہو جائے گا۔ میرے لیے یہ بیگم کا نکتہء نظر قابل قبول نہیں تھا۔ میں نے تو پاکستان کی دکانوں پر لکھا دیکھا ہے، خریدی ہوئی چیز واپس یا تبدیل نہیں ہوگی۔ مجھے تو چند منٹ بعد واپس کرنے پر بھی کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں آ رہا تھا کہ دکان دار نے اسی خوش دلی سے چیز واپس لے لی ہو، جس خوش دلی کا مظاہرہ وہ بیچنے کے موقع پر کر رہا تھا۔ خیر! میں نے کہا کہ یہ کام تم ہی کر کے دکھاؤ۔ ہم دونوں وال مارٹ پہنچ گئے۔ کاؤنٹر پر موجود خاتون نے پہلے رسید مانگی۔ پھر مختلف زبانی معلومات کے ذریعے کمپیوٹر سے اس خرید و فروخت کا پتہ لگایا اور مسکراتے ہوئے کہا: "بی ہاں! آپ نے فلاں تاریخ کو یہ کپڑا ہمارے اسٹور سے خریدا تھا۔ آپ تبدیل کروانا چاہیں گے یا کیش؟" اکیش۔ میں نے جواب دیا۔ اس خاتون نے مسکراتے ہوئے پوری رقم واپس کر دی اور کہا "Nice Shopping"

